28

جماعت احمدیہ کے لئے امتحان میں کامیاب ہونے کا سبق

(فرمودہ 4 ستمبر 1942ء)

تشہد، تعوّذ اور سورۃ فاتحہ کی تلاوت کے بعد فرمایا:۔

"میری طبیعت چونکہ علیل ہے کل صبح تو کمر درد میں افاقہ تھا مگر کل ایک جنازہ کے ساتھ جانا پڑا اس وجہ سے یا شاید کسی اَور سبب سے آج صبح سے درد زیادہ ہے اور مَیں کھڑا نہیں ہو سکتا۔ اس لئے خطبہ اختصار سے بیان کروں گا۔

مَیں نے بعض گزشتہ خطبات میں جماعت کو توجہ دلائی ہے کہ یہ دن بہت نازک ہیں اور ایک ایسا سلسلہ مصائب اور مشکلات کا سامنے نظر آ رہا ہے کہ جو اپنی شکلیں بدلتا ہوا ایک لمبے عرصہ تک چلتا چلا جائے گا۔ جہاں تک تو جنگ کا تعلق ہے مَیں سمجھتا ہوں کہ وہ 1944ء تک یا ہو سکتا ہے کہ 1945ء تک یا اس سے بھی پہلے اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو ختم ہو جائے گی۔ لیکن موجودہ جنگ ہی ایک ایسی چیز نہیں جو اپنے ساتھ فتنے لائی ہے بلکہ مختلف ممالک کے لئے جنگ کے بعد بھی فتنوں کا سلسلہ جاری رہنا مقدر معلوم ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کا منشاء ہے کہ وہ دنیا میں خلا پیدا کرے۔ سیاسی بھی، اقتصادی بھی اور مذہبی بھی۔ اور موجودہ زمانہ کو مدنظر رکھتے ہوئے اور حالات پر نظر ڈالتے ہوئے کہنا پڑتا ہے کہ سیاسی اور اقتصادی خلا سے تو سرِدست ہمارا چنداں واسطہ نہ ہو گا کیونکہ ہماری جماعت کی تعداد اور اس کی طاقت ابھی اس خلا کو پورا کرنے کے لئے کافی نہیں لیکن مذہبی خلا صرف اور صرف ہماری جماعت ہی پورا کر سکتی ہے۔ مگر اس خلا کا پورا کرنا صرف اس وجہ سے کہ یہ مذہبی ہے اور ہم مذہبی جماعت ہیں پُرامن نہیں کہلا سکتا۔ دنیا میں پُرامن سے پُرامن لوگوں کی بھی دوسرے مخالفت کرتے ہیں۔ رسول کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے

تیرہ سال تک مکہ میں بھلا کونسی تلوار چلائی تھی مگر اس کے باوجود بھائی بھائی سے، خاوند بیوی سے اور بیوی خاوند سے لڑے۔ دوست نے دوست کو، ماؤں نے بیٹوں کو اور بیٹوں نے ماؤں کو جواب دے دیا۔ بھلا وہ کونسا سیاسی ظلم تھا اور کونسا اقتصادی نقصان تھا جو مسلمانوں سے مشرکوں کو پہنچ رہا تھا۔ مسلمانوں کا اس سے زیادہ کیا قصور تھا کہ وہ اپنے گھروں میں خدا تعالیٰ کا نام لیتے تھے۔ اس کے سوا وہ نہ مکہ کی سیاست کو کوئی نقصان پہنچا رہے تھے اور نہ اقتصادیات کو اور نہ ہی وہ اہلِ مکہ کے ساتھ کسی قسم کی بدسلوکی روا رکھتے تھے۔ اگر کوئی فرق تھا تو صرف یہ کہ پہلے جو ظلم وہ کر لیا کرتے تھے۔ اب اسلام کی وجہ سے اسے چھوڑ دیا تھا۔ اس کے سوا کوئی فرق نہ تھا۔ احادیث میں رسول کریم صَلَّیٰ اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے متعلق آتا ہے کہ آپ ایک دن خانہ کعبہ میں نماز پڑھ رہے تھے کہ دشمنوں نے آکر حملہ کر دیا۔ بھلا ابو جہل اور اس کے ساتھیوں کا نماز سے کیا نقصان ہوتا تھا۔ مسلمان اپنے خدا کو یاد کرتے تھے اور دل میں کرتے تھے۔ چند کلمات آہستہ آہستہ ان کی زبان پر جاری ہوتے تھے اور اس سے دوسروں کا کیا نقصان ہو سکتا تھا۔ مگر انہوں نے رسول کریم صَلَّیٰ اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم پر جبکہ آپ نماز پڑھ رہے تھے، حملہ کر دیا۔ آپ کے گلے میں پٹکا ڈال کر گلا گھونٹنا چاہا۔ اتنے میں کسی نے دوڑ کر حضرت ابو بکرؓ کو خبر دی۔ آپ آئے اور جو فقرہ آپ نے اس وقت کہا۔ وہ اس وقت کی کیفیت کا پورا پورا آئینہ ہے اور پوری طرح اسے آشکار کرتا ہے۔ انہوں نے ان کو ہٹاتے ہوئے کہا کہ تم کو اس آدمی سے کیا واسطہ جس کا جرم سوائے اس کے کچھ نہیں کہ وہ ایک خدا کا پرستار ہے اور اس کی پرستش کرتا ہے۔ [1] یعنی وہ نہ تمہاری سیاست میں تمہارا مقابلہ کرتا ہے، نہ اقتصادی نظام میں کوئی دخل دیتا ہے اور نہ تمہاری پنچایتوں میں بولتا ہے اور نہ تمہاری پارٹی بازیوں میں حصہ لیتا ہے۔ اس کا جرم سوائے اس کے کیا ہے کہ وہ ایک خدا کی عبادت کرتا ہے اور ایک ایسا کام کرتا ہے جس کے کرنے میں انسان اپنے قریب ترین تعلق دار کی مداخلت سے بھی آزاد ہوتا ہے۔ باپ بیٹے کی عبادت میں دخل نہیں دے سکتا اور بیٹا باپ کی عبادت میں دخل نہیں دے سکتا۔ وہ کونسا ایسا کام کرتا ہے جس کا تمہارے ساتھ واسطہ ہے مگر باوجود اس کے مسلمانوں کی مخالفت اس قدر بڑھ گئی تھی کہ مائیں اپنے اکلوتے بیٹوں کو جدا کر دیتی تھیں۔

ایک صحابیؓ کا واقعہ ہے۔ ان کی عمر 18-20 سال کی تھی کہ وہ مسلمان ہو گئے۔ وہ والدین کے اکلوتے بیٹے تھے مگر جب ماں باپ کو علم ہوا کہ وہ مسلمان ہو گئے ہیں تو ان کے ساتھ چھوت چھات شروع کر دی اور ان کے برتن الگ کر کے کہہ دیا کہ تم ان میں کھایا پیا کرو اور پھر اتنی سختی شروع کر دی کہ ان سے کہا کہ محمد (صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم) کے پاس نہ جایا کرو اور آخر کچھ عرصہ تک یہ سختیاں سہنے کے بعد تنگ آ کر وہ نوجوان صحابی ہجرت کر کے حبشہ کی طرف چلے گئے اور وہاں کئی سال رہنے کے بعد واپس آئے اور ماں باپ کے ہاں گئے۔ ان کا خیال تھا کہ شاید اب ماں باپ کا دل پسیج گیا ہو گا اور اب وہ سختی نہ کریں گے۔ جب وہ گھر پہنچے تو ماں اٹھی بیٹے کو گلے لگایا اور پیار کیا۔ اس نے خیال کیا کہ اب میرے بیٹے نے توبہ کر لی ہو گی اور بیٹے نے سمجھا کہ اب ماں کے دل میں رحم آ گیا ہو گا اور وہ سمجھ گئی ہو گی کہ میرے مذہب کے معاملہ میں اسے دخل نہ دینا چاہئے۔ دونوں فریق ایک دوسرے کے متعلق اس غلط فہمی میں تھے کہ اس نے اپنا مقام چھوڑ دیا ہے حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ ماں اسی طرح تعصب پر قائم تھی اور بیٹا بھی اپنے ایمان میں اسی طرح پختہ تھا مگر دونوں غلط فہمی میں تھے۔ بیٹا سمجھتا تھا کہ ماں آئندہ میرے مذہب میں دخل نہ دے گی اور ماں سمجھتی تھی کہ میرے بیٹے نے توبہ کر لی ہو گی۔ مگر تھوڑی دیر کی گفتگو کے بعد دونوں کو اپنی اپنی غلطی کا علم ہو گیا۔ ماں نے کہا بیٹا تمہیں ایک اجنبی سے کیا واسطہ جس سے تمہاری نہ کوئی رشتہ داری ہے اور نہ تعلق۔ تم ہمارے اکلوتے بیٹے ہو۔ کیا تم اس محبت کو بھول جاؤ گے جس سے مَیں نے تمہیں پالا پوسا ہے اور اس قربانی کو نظر انداز کر دو گے جو تمہارا باپ تمہارے لئے کرتا رہا ہے اور ہمارے دلوں کو زخمی کر کے اس شخص کے پاس چلے جاؤ گے جس کے پاس تمہارا جانا ہمیں پسند نہیں۔ یہ بات سن کر بیٹے نے کہا کہ ماں یہ بات نہیں کہ مَیں تمہاری محبت کو بھول گیا ہوں۔ مَیں اپنے باپ کی قربانیوں کو بھی جانتا ہوں لیکن اگر میرا تمہارے پاس رہنا اس شرط سے مشروط ہے کہ مَیں محمد صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے پاس نہ جاؤں اور ان کو چھوڑ دوں تو یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ اگر محمد صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے ساتھ تعلق رکھتے ہوئے میرا گھر میں آنا تمہیں ناگوار ہے تو مَیں گھر میں نہ آؤں گا لیکن مَیں اس تعلق کو ہرگز نہیں چھوڑ سکتا۔ ماں بھی تعصب بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ بغض و کینہ میں پکی تھی۔ اس نے کہا کہ بیٹا اگر تُو محمد (صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم)

کو نہیں چھوڑے گا تو باوجود یکہ تُو ہمارا اکلوتا ہے اور ہمیں تمہارے ساتھ اس قدر محبت ہے ہم تمہارے گھر میں آنے کے روادار نہیں۔ یہ سن کر بیٹے نے کہا کہ اچھا پھر میرا آخری سلام ہے، مَیں آئندہ نہیں آؤں گا۔[2]

تو اس ظلم اور اس سختی کی وجہ کیا تھی۔ مسلمان اہل مکہ پر کوئی سیاسی، اقتصادی اور اخلاقی ظلم نہ کرتے تھے۔ ان کا قصور تھا تو صرف اتنا کہ وہ علیحدگی میں اپنے رب کی عبادت کرتے تھے۔ حضرت مسیح ناصری کس سیاسی اور اقتصادی برتری کے مدعی تھے۔ وہ چند ایک مچھلیاں پکڑنے والوں کو علیحدہ لے جا کر خدا کی تعلیم دیتے تھے مگر انہیں کس قدر مصائب میں مبتلا کیا گیا۔ ان پر مقدمات بنائے گئے، عدالتوں میں گھسیٹا گیا، ان کو صلیب پر لٹکایا گیا اور اپنی طرف سے دشمنوں نے انہیں قتل ہی کر کے دم لیا۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں صلیب پر نہ مرنے دیا۔ پس ہماری جماعت کا یہ خیال کر لینا کہ وہ امن پسند ہیں اور مذہبی جماعت ہیں اس لئے ان پر یہ فتنے نہ آئیں گے۔ بالکل غلط خیال ہے۔ تمہارے امن پسند ہونے کی وجہ سے دشمن تم پر حملہ کرنے سے رک نہیں سکتا۔ صرف ایک چیز ہے جو اسے حملہ سے روک سکتی ہے لیکن مَیں نہیں سمجھتا کوئی مومن ایسا بے غیرت ہو سکتا ہے کہ اسے اختیار کرے اور وہ منافقت ہے۔ صرف منافقت تمہیں دشمن کے حملہ سے بچا سکتی ہے، امن پسندی نہیں۔ اور کیا کوئی مومن ہے جو یہ گوارا کر سکے کہ وہ دشمن کے حملہ سے امن میں رہے گو ایمان ہاتھ سے جاتا رہے۔ خوب یاد رکھو کہ امن تمہیں اس صورت میں مل سکتا ہے کہ جب تم منافقت قبول کر لو اور اگر اسے اختیار نہ کیا جائے تو امن میں رہنے کی کوئی صورت نہیں۔ ہم خواہ ساری دنیا کو امن دینے پر کیوں نہ تُلے ہوئے ہوں اور دنیا کی ذلیل سے ذلیل خدمت کرنے پر کیوں نہ آمادہ ہوں اور زیادہ سے زیادہ قربانی دنیا کے لئے کیوں نہ کریں۔ ہماری قربانیاں حضرت مسیح ناصری علیہ السلام اور آنحضرت ﷺ سے نہیں بڑھ سکتیں اور ان سے زیادہ خدمت خلق نہیں کر سکتے اور جب ان کو بھی تکالیف دی گئیں، مارا گیا اور قتل کرنے کی کوششیں کی گئیں تو ہم کس طرح امن میں رہ سکتے ہیں۔ اگر دنیا ہمیں امن سے رہنے دے تو اس کا یہ مطلب ہو گا کہ ہمارے اندر منافقت ہے۔ پس ہمیں اپنے نفسوں کو ٹٹولتے رہنا چاہئے

کہ کہاں تک خدمتِ خلق کی وجہ سے ہماری مخالفت ہوتی ہے اور کہاں تک اس میں ہمارے نفس کا دخل ہے۔ اگر مزاج میں درشتی ہے، اخلاق میں کمی ہے تو سمجھ لینا چاہئے کہ یہ مخالفت خدا کے لئے نہیں، ہمارے نفسوں کی وجہ سے ہے اور اس لئے اصلاحِ نفس کی طرف توجہ کرنی چاہئے۔ لیکن اگر اخلاق میں نقص اور مزاج میں سختی نہیں تو سمجھ لینا چاہئے کہ مخالفت خدا تعالیٰ کے لئے ہو رہی ہے اور جو تکالیف آئیں انہیں انعام اور ثواب سمجھنا چاہئے۔

پس اس پُر فتن زمانہ میں قریب ترین انجام کی طرف امید کی نگاہ مت ڈالو۔ اللہ تعالیٰ تمہارے لئے زیادہ سے زیادہ مشکلات پیدا کرے گا، گو اگر ہم نے اسے راضی رکھا تو ساتھ ہی ان کا تریاق بھی مہیا کرتا رہے گا لیکن آگ ضرور جلے گی اور بھٹیاں ضرور بھڑکائی جائیں گی۔ خوب یاد رکھو کہ کبھی کسی مذہبی جماعت نے ترقی نہیں کی جب تک کہ وہ خدا تعالیٰ کے لئے آگ میں نہ چلی ہو اور خون کی ندیوں میں سے نہ گزری ہو۔ پس یہ دعائیں نہ کرو کہ فتنے پیدا نہ ہوں کیونکہ وہ اسلام کی ترقی کے لئے پیدا ہو رہے ہیں اور کسی کی دعائیں انہیں پیدا ہونے سے روک نہ سکیں گی۔ افراد سے متعلق فتن دعاؤں سے رک جاتے ہیں۔ کسی کے گھر میں بیماری ہو تو وہ دعا سے رک سکتی ہے، کسی کے رشتہ دار پر مقدمہ ہو تو وہ اس سے بچ سکتا ہے، کوئی مقروض ہو جائے تو دعا سے اس کا قرضہ اترنے کے سامان پیدا ہو سکتے ہیں، کسی کو ذلت پہنچی ہو تو اس کی عزت قائم ہو سکتی ہے، کسی کے گھر میں جہالت ہو تو علم آ سکتا ہے لیکن وہ عذاب جو دنیا پر مذہب کی ترقی اور حقیقی انقلاب پیدا کرنے کے لئے آتے ہیں وہ ٹلا نہیں کرتے۔ ہاں دعاؤں سے تمہارے حق میں ان کی تلخی میں کمی ہو سکتی ہے۔ پس یہ امید نہ رکھو کہ یہ فتنے ٹل جائیں گے اور یہ دعائیں بھی نہ کرو کہ وہ ٹل جائیں۔ ہاں یہ دعائیں کرو کہ اللہ تعالیٰ ان کی تلخی کو اسلام اور احمدیت کے لئے کم کر دے۔ یہ فتن آئیں گے ضرور۔ ایک فتنہ شکل تبدیل کر کے دوسری شکل میں آئے گا، وہ شکل بدل لے گا اور تیسری صورت میں آئے گا اور اس کے بعد چوتھی میں اور اسی طرح فتنے آتے جائیں گے جب تک کہ ایک طرف تو جماعت احمدیہ اس خلا کو پُر کرنے کے قابل نہ ہو جائے اور دوسری طرف دنیا اسے پُر کرنے کی اجازت نہ دے دے۔ جب تک یہ نہ ہو گا فتنے رک نہیں سکتے اور انقلاب کے سامان دور نہ ہوں گے۔ پس انہیں روکنے

کے لئے دعائیں نہ کرو۔ ہاں اپنی ذات کے لئے دعائیں کرو کہ اللہ تعالیٰ تمہیں ان سے بچائے۔ ذاتی طور پر فتن سے بچنے کی دعائیں قبول ہو سکتی ہیں۔ ہزاروں صحابہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جنگوں میں جاتے تھے مگر کیا سارے مارے جاتے تھے۔ مائیں اپنے بچوں کو بھیجتی تھیں، تو کیا وہ یہ دعائیں کرتی تھیں کہ وہ مارے جائیں، نہیں۔ اگر ایک طرف وہ ان کو میدانِ جہاد میں بھیجتیں اور تاکید کرتیں کہ پیچھے نہ ہٹنا۔ وہاں وہ اللہ تعالیٰ سے یہ دعائیں بھی کرتی تھیں کہ اللہ تعالیٰ انہیں مظفر و منصور زندہ واپس لائے۔ مَیں نے خنساء کا واقعہ کئی بار بیان کیا ہے۔ انہوں نے اپنے بیٹوں کو یہی نصیحت کی تھی کہ یا فتح حاصل کر کے واپس آنا اور یا پھر لڑتے لڑتے مر جانا۔ اگر شکست کھا کر تم زندہ لوٹے تو مَیں قیامت کے دن تمہیں اپنا دودھ نہ بخشوں گی۔[3] لیکن کیا وہ چاہتی تھیں کہ ان کے بیٹے مارے جائیں۔ ان کے بیٹے جب میدان جنگ میں چلے گئے تو وہ خود خدا تعالیٰ کے حضور سجدہ میں گر گئیں اور رو رو کر دعائیں کرنے لگیں کہ اے اللہ مَیں نے تو اپنے بیٹوں کو مرنے کے لئے بھیج دیا ہے مگر تیرے اختیار میں ہے کہ ان کو زندہ بھی رکھ لے اور مسلمانوں کو فتح بھی دے دے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کی دعاؤں کو سنا، مسلمانوں کو فتح بھی نصیب ہوئی اور ان کے بیٹے بھی واپس آ گئے۔

پس یہ دعائیں کرو کہ وہ قربانیاں جو تمہیں کرنی پڑیں گی تم کو بھسم نہ کر دیں۔ فتنوں کے آنے کے لئے تیار رہو مگر ان کے زہر سے بچنے کے لئے دعائیں کرتے رہو۔ دیکھو جب حضرت مسیح ناصری علیہ السلام کے صلیب پر لٹکائے جانے کا وقت آیا تو انہوں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ اے اللہ اگر ہو سکے تو یہ پیالہ مجھ سے ٹلا دے لیکن اگر یہ تیری مرضی کے خلاف ہے تو نہ سہی۔ مومن یہ دعا کبھی نہیں کرتا کہ اللہ تعالیٰ کا عذاب آئے اور مجھے مار دے۔ یہ دعا مومن کی نہیں بلکہ ایک جاہل اور متہوّر کی ہو سکتی ہے۔ مومن ابتلاؤں سے بچنے کی دعائیں ضرور کرتا ہے لیکن ابتلا کے پیش آ جانے پر پیچھے ہٹنے کی کوشش نہیں کرتا۔ اس کا دل چاہتا ہے کہ عذاب ٹل جائے، وہ ابتلا میں نہ ڈالا جائے اور اسے مزید خدمتِ دین و خدمتِ خلق کا موقع مل سکے مگر جب مشکلات آتی ہیں تو پیچھے نہیں ہٹتا۔ جنگ کے موقع پر وہ اس مقام پر کودتا ہے جو زیادہ سے زیادہ خطرناک ہو۔ یہ دونوں چیزیں مل کر ایک مومن کو کامل بناتی ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام

پر جب مصیبت آئی تو وہ بھاگ نہیں گئے۔ انہوں نے یہودیوں سے صلح کی کوشش نہیں کی ہاں ساری رات یہ دعا ضرور کرتے رہے کہ اگر یہ پیالہ مجھ سے ٹل سکتا ہے تو ٹلا دے اور اگر نہیں تو مَیں تیری مرضی پر راضی ہوں۔4

یہی طریق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا تھا، کیا آپ دعائیں نہ کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو خطروں سے بچائے اور فتن سے محفوظ رکھے مگر یہ نہیں کہ آپ میدانِ جنگ سے پیچھے ہٹیں بلکہ سب سے آگے ہوتے تھے اور صحابہؓ کہتے تھے کہ ہم سب سے بہادر اس شخص کو سمجھتے تھے جو جنگ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہوتا کیونکہ سب سے زیادہ خطرناک مقام وہی ہوتا تھا جہاں آپ ہوتے۔5

پس ہماری جماعت کو بھی اپنا یہی طریق بنانا چاہئے تبھی اللہ تعالیٰ کی برکتیں اس پر نازل ہو سکتی ہیں۔ جو بزدل ہے اور میدان سے بھاگتا ہے وہ بھی مومن نہیں اور جو یہ دعا کرتا ہے کہ عذاب آئے وہ بھی مومن نہیں۔ وہ خدا تعالیٰ کا امتحان لینا چاہتا ہے سوائے اس کے کہ کوئی غلطی سے ایسی بات مُنہ سے نکال دے۔ احادیث میں حضرت انس کے چچا کا ایک واقعہ آتا ہے وہ بدر کی لڑائی میں شریک نہ تھے۔ جب دوسرے صحابہ اس لڑائی کے واقعات ان کے سامنے بیان کرتے اور کہتے کہ ہم یوں لڑے اور اس طرح لڑائی کی تو وہ کہتے کہ تم نے کیا لڑنا تھا۔ اگر کبھی موقع آیا تو ہم بتائیں گے کہ لڑائی کیا ہوتی ہے۔ عام طور پر ایسا فقرہ مومنانہ اخلاق کے منافی ہے مگر وہ یہ بناوٹ سے نہ کہتے تھے بلکہ رشک کی وجہ سے کہتے تھے۔ جب وہ دوسروں سے سنتے کہ انہوں نے اس طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کی اور اس طرح دشمنوں کو مارا تو ان کا دل خون ہو جاتا اور ان کے دل میں یہ حسرت پیدا ہوتی کہ کاش مَیں بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جان کی حفاظت کرنے والوں میں ہوتا۔ یہ فقرہ دل کے خون ہونے سے ان کے مُنہ سے نکلتا تھا، تکبر اور فخر کی وجہ سے نہیں۔ اللہ تعالیٰ جانتا تھا کہ وہ یہ فقرہ کسی تصنّع یا بناوٹ سے نہ کہتے تھے بلکہ وہ اپنے دل کے خون کو اس طرح بہاتے اور اس پھوڑے کو جو ان کے دل میں تھا اس طرح شگاف دیتے تھے۔ یہ ایک عاشق کا فقرہ تھا جو اسے نیکی سے محروم نہ کرتا۔ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ایسے سامان پیدا کر دیئے کہ انہیں اپنی اس بات کو درست

ثابت کرنے کا موقع مل گیا اور جو کچھ وہ مُنہ سے کہتے تھے اسے سچ ثابت کر دکھایا۔ چنانچہ اُحد کی جنگ میں جب آنحضرت ﷺ کی شہادت کی خبر مشہور ہوئی تو انہوں نے حضرت عمرؓ کو ایک ٹیلے پر بیٹھے اور روتے ہوئے دیکھا تو دریافت کیا کہ عمر رونے کی کیا بات ہے جبکہ مسلمانوں کو فتح ہو گئی ہے۔ حضرت عمرؓ نے جواب دیا کہ تمہیں پتہ نہیں رسول کریم ﷺ شہید ہو گئے ہیں۔ حضرت انس کے چچا نے جب یہ بات سنی تو اس وقت وہ کھجوریں کھا رہے تھے اور صرف ایک کھجور ہاتھ میں تھی اسے اٹھا کر پھینک دیا اور کہا کہ میرے اور خدا کے درمیان اس کے سوا اَور کونسی روک ہے اور اپنے عشق کے لحاظ سے حضرت عمر کی طرف حقارت سے دیکھا اور کہا عمر! جب آنحضرت ﷺ اگلے جہان چلے گئے تو تم یہاں بیٹھے کیوں روتے ہو۔ جہاں آپ گئے وہیں ہم چلتے ہیں اور اکیلے ہی دشمن کے تین ہزار کے لشکر پر حملہ کر دیا۔ کفار بھی آپ کو شاید پاگل سمجھتے ہوں گے۔ آپ نے لڑتے لڑتے شہادت پائی اور جب جنگ کے بعد آپ کی لاش تلاش کروائی گئی تو ستّر ٹکڑے ملے۔ جوڑ جوڑ الگ ہو چکا تھا۔[6] یہی لوگ تھے جن کے حالات کو دیکھ کر اللہ تعالیٰ نے فرمایا مِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ۔[7] یعنی یہ میری پیاری جماعت کے لوگ ہیں جن میں سے بعض نے اس وعدہ کو جو انہوں نے اپنے خدا سے کیا تھا پورا کر دیا اور بعض ایسے ہیں کہ انہوں نے گو ابھی پورا تو نہیں کیا مگر اس موقع کے انتظار میں ہیں کہ کب اسے پورا کر سکیں۔

پس یہ لوگ تھے صحابہؓ جو ایک طرف دعائیں کرتے تھے کہ خدایا ہمیں ہر ابتلاء سے بچا، کیا وہ یہ دعائیں نہ کرتے تھے کہ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّ فِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّ قِنَا عَذَابَ النَّارِ۔[8] ضرور کرتے تھے اور اس میں دنیا کے تمام حسنات کے حاصل ہونے کی دعا موجود ہے اور اس طرح اس میں سارے ابتلاؤں سے بچنے کی دعا ہے مگر جب ان کو عمل کا موقع پیش آتا تو وہ ہر خطرناک مقام پر کود جاتے تھے۔ ایک طرف وہ ابتلاؤں سے بچنے کی دعائیں کرتے تھے اور دوسری طرف ابتلا آنے پر اپنے آپ کو شدید خطرات میں ڈال دیتے تھے۔ یہی مومن کی علامت ہے۔ مومن ادھر تو خدا تعالیٰ کے غضب سے ڈرتا ہے مگر دوسری طرف جب دنیا خدا تعالیٰ کو پھولوں اور عطروں میں ڈھونڈتی ہے، نرم گدوں پر بیٹھ کر خدا تعالیٰ

کو دیکھنا چاہتی ہے۔ مومن اسے تلوار میں دیکھتا ہے، دہکتی ہوئی آگ میں دیکھتا ہے، جس میں اسے ڈالا جاتا ہے، غاروں اور کھڈوں میں دیکھتا ہے جہاں اسے پھینکا جاتا ہے اور دریاؤں کی تہہ میں دیکھتا ہے جہاں اسے ڈبویا جاتا ہے اور مومن وہی ہے جس میں یہ دونوں باتیں پائی جائیں اور اس کے لئے جماعت کو تیار کرنا گویا امتحان میں کامیاب ہونے کا سبق یاد کرانا ہے۔"

(الفضل 12 ستمبر 1942ء)

1: بخاری کتاب التفسیر تفسیر سورۃ المومن

2: طبقات ابن سعد قسم اول۔ جزء ثالث صفحہ 83

3: اسد الغابۃ جزء خامس صفحہ 443 مطبوعہ طہران 1377ھ

4: متی باب 26 آیت 39

5: مسلم کتاب الجھاد باب غزوۃ حنین

6: سیرت ابن ہشام جلد 3 صفحہ 88۔ مطبوعہ مصر 1936ء

7: الاحزاب: 24

8: البقرۃ: 202